کشور ناہید
آباد خرابہ

آباد خرابہ

(شاعری)

کشور ناہید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ٹینڈر نوٹس

انہوں نے کہا
ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
جنہیں بیدردی سے گولی چلانے کی مہارت ہو
جن کے اندر انسانیت نام کی کوئی بو باس نہ ہو
جنہیں صرف اور صرف حکم ماننا آتا ہو

ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
جنہیں مال و دولت کی شہوت ہو
کہ ہم ان کی جیبوں کو کبھی خالی نہیں ہونے دیں گے
کہ ہم اگر ان کی کھال بھی اتار لیں
تو وہ اِسے نعمت عرب سمجھیں گے

ل 34 اسلامی ملکوں کا معاہدہ

غزل

شام بانہوں میں لیے رات کی رانی آئی
اے محبت تجھے دینے کو سلامی آئی
تشنگی اتنی کہ دریا ہے مری آنکھوں میں
نا شناسا ترے ہونے کی گواہی آئی
جس سے منسوب ہوا میرے خیالوں کا سفر
ڈھونڈنے اس کو مرے ساتھ ہوا بھی آئی
مجھ میں موجود ہے وہ اور نہیں ہے ظاہر
اس کی خواہش در و دیوار بناتی آئی
زخم ایسا تھا ٹپکتا تھا لہو آنکھوں سے
دل بیاں کر نہ سکا ایسی تباہی آئی
پرسشِ حال کرے کون کسے ہے فرصت
کب مرے صحن میں نادیدہ خدائی آئی

غزل

دیوار و در میں غم کا تماشہ تو ہے ابھی
وہ خود نہیں پہ اس کا بلاوا تو ہے ابھی

مانوس ہو چلی ہے اداسی سے زندگی
پاؤں کے آبلوں کا نظارا تو ہے ابھی

سچ ہے کہ زہرِ عشق، تلطف گریز تھا
چنگاریوں نے ورنہ پکارا تو ہے ابھی

خوابوں کو دربدر ہی رکھا تھا نصیب نے
آشفتگی میں جاں کا خسارا تو ہے ابھی

معلوم ہے کہ کچھ بھی نہیں دشتِ زیست میں
امیدِ خواب ہی پہ گزارا تو ہے ابھی

رخصت شبِ فراق! بہت سہہ لیا تجھے
ہمراز گرچہ خواب ستارا تو ہے ابھی

بے تابیاں سمیٹ کے پوچھا کرے ہے دل
قسمت میں اپنی صبح کا تارا تو ہے ابھی

غزل

تجھ سے بہت قریب بھی، تنہا بھی تھے ہمیں
تھے آبروئے عشق پہ رسوا بھی تھے ہمیں

آنکھوں میں خون تھا کہ زمیں تھی لہولہو
زنجیرِ غم پہن کے تماشا بھی تھے ہمیں

ہر ہر قدم پہ اک نئی دیوار تھی کھڑی
اس رات کے سفر میں، اجالا بھی تھے ہمیں

معلوم تھا یہ عشق نہیں، مات کا ہے کھیل
پسپا ہوئے تھے ہم ہی، حوالہ بھی تھے ہمیں

معلوم تھا کہ وحشتیں اپنی بساط ہیں
معلوم تھا کہ شام کا تارہ بھی تھے ہمیں

آنکھوں میں خواب چبھتے رہیں گے تمام عمر
یہ درد لا دوا تھا، مسیحا بھی تھے ہمیں

اب یاد بھی نہ آؤ کہ وعدہ بھی تھا یہی
دشتِ بلا میں وعدۂ فردا بھی تھے ہمیں
اے صبحِ نو بہار کبھی تو اِدھر بھی آ
احباب جانتے ہیں کہ تجھ سا بھی تھے ہمیں

غزل

زخم بھی تازہ تھا اور اس پہ ہوا بھی تازہ
دل نے رکھا تھا مگر رخشِ دعا بھی تازہ

تر بتر ہے مرے ہاتھوں میں وہی جامنی رنگ
تم نے پوچھا تھا کہ ہوتی ہے گھٹا بھی تازہ

اب تلک ہے وہی جلتا ہوا صحرا وہی میں
اب تلک ہے تپشِ شوقِ ندا بھی تازہ

کس بہانے سے تجھے بھول رہوں اور خوش ہوں
پھر بنا لے گا یہ دل ایک خدا بھی تازہ

کس بہانے سے میں جاگوں، تجھے ڈھونڈوں اب کے
اب تو اس صحن میں ٹھہرے نہ ہوا بھی تازہ

آئینہ مانگتا رہتا ہے وہی عکس ترا
آنکھ رکھتی ہے ترا رنگِ قبا بھی تازہ

بس بہت حوصلہ رکھنے کی کہانی کہہ لی
رات کو پھول مسلتی ہے ہوا بھی تازہ

غزل

دل کی دیوار میں آئینہ رکھا تھا کس نے
مجھ کو پہچانتے رہنے کو کہا تھا کس نے
دشمنِ جاں ترے ہاتھوں میں تو پتھر بھی نہ تھا
لذتِ خواب کو نم دیدہ کیا تھا کس نے
اب بہت دور نکل جانے کو جی چاہتا ہے
مجھ کو جاتے ہوئے دیوانہ کہا تھا کس نے
اس کی آنکھوں میں بلاوا ہی نہ تھا، سچ یہ ہے
اے شبِ ہجر تجھے ساتھ کیا تھا کس نے
انجمن انجمن قصے تھے ہمارے کل تک
آج ویرانی کو آنکھوں میں رکھا تھا کس نے
نام تو اس کا بھلا سا تھا مگر یاد نہیں
سسکیاں لے کے تجھے یاد کیا تھا کس نے

غزل

مجھ کو دریوزہ گرِ خواب بنا دیتا ہے
جب بھی آتا ہے مری پیاس بڑھا دیتا ہے

پوچھ لیتا ہے مرا حال وہ دیواروں سے
اپنے ہی ہاتھ سے تصویر بنا دیتا ہے

اس نے سیکھا ہی نہیں خواب میں رہنے کا سفر
ایسا کوئی نہیں جو آ کے جگا دیتا ہے

شام ہوتے ہی سنورتا ہے مری آنکھوں میں
یہ نظارہ ہی مجھے آگ بنا دیتا ہے

آئینہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے مجھے آخرِ کار
لطفِ تائید مجھے تجھ سے سوا دیتا ہے

غزل

یہ دشتِ فراموشی ٹھہرنے نہیں دیتا
لیکن درِ خواہش کو بھی کھلنے نہیں دیتا
یہ رسم ہے دیوار و درِ گریہ کی لیکن
دریوزہ گرِ خواب تو رونے نہیں دیتا
آشوب ہے ایسا کہ سراسیمہ ہے وحشت
یہ عجزِ بیاں، زخم بھی دھونے نہیں دیتا
ہاں منزلِ امید بھی نزدیک تھی لیکن
غم خانۂ جاناں بہلنے نہیں دیتا
آنکھوں میں وہی رنجِ اسیری ہے مسلط
جو حشر بپا ہونا تھا، ہونے نہیں دیتا
بے نام رہی خواہشِ دیدار ہمیشہ
شبنم کی طرح وہ مجھے ہنسنے نہیں دیتا
آنگن میں لہو دیکھ کے روتی نہیں آنکھیں
یہ دل تو سلگتا ہے پہ جلنے نہیں دیتا

غزل

کبھی بھلایا نہیں، یاد بھی کیا نہیں ہے
یہ کیسا جرم ہے جس میں کوئی سزا نہیں ہے

میں بات بات پہ رونے کا ماجرا پوچھوں
وہ ہنس رہا ہے بتانے کو کچھ رہا نہیں ہے

زمیں پہ آہ و بکا اور خونِ ناحق بھی
زبانِ خلق یہ پوچھے ہے، کیا خدا نہیں ہے!

کلام کرنے کو ناصح رہا نہ واعظ ہے
میں کیا کہوں کہ مرے پاس بددعا نہیں ہے

بس اب تو آنکھ میں صحرا ہی جم گیا آ کے
سمجھ لو خواب بھی دہلیز پہ رکھا نہیں ہے

قدم قدم پہ وہی تلملاتی خواہش ہے
پیام لانے کو کوئی بھی دلربا نہیں ہے

مری اداسی مرے کام آ سکی نہ کبھی
بس اب سوال بھی کرنے کا حوصلہ نہیں ہے

رقیبِ خواہشِ موجودہ سن لیا تو نے
چمن بہت ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے

غزل

غم کی تاکید بھی کی اور کہا شاد رہو
یوں ہی محفل میں رہو گرچہ تہہ باد رہو
گل فروشوں کی طرح رشتۂ خوشبو نہ رکھو
اس کو ہی بھولنا ٹھہرا ہے، جسے یاد رہو
ہر جبیں لالۂ خوں سے ہے تپیدہ لیکن
دل یہ کہتا ہے اِسی کوچے میں آباد رہو
چشم بستہ رہو، تعمیلِ وفا کرتے رہو
حاکمِ شہر کی خواہش ہے قفس زاد رہو
پہلے تو دستکیں دیتی تھیں دلاسے لیکن
اب تو کہتی ہیں کہ در بندشِ صیاد رہو
اپنی محکومی صدا دیتی ہے اور پوچھتی ہے
حکم کس کا تھا کہ نا واقفِ ہمزاد رہو

ہم ہر روز شام کو ان کے سامنے
معرفت کے جام و مینا رکھیں گے
ان کے ہاتھ میں دیدارِ حرم کے وعدے کی
تسبیح پکڑا دیں گے
ان کے سارے گناہ معاف کروا دیں گے
کہ انہیں معلوم ہوگا
کہ وہ غلام ہیں
اور اسلاف و ایمان کی جنگ لڑ رہے ہوں گے

ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
جو دن رات کی تمیز کے بغیر
ہر لمحے مبارزت پہ آمادہ ہوں
کسی بھی حکم کے بارے میں
نہ سوچتے ہوں اور نہ سوچ سکتے ہوں

ہمیں کچھ ایسے غلام چاہئیں
جو غلامی پر شاکر رہنے کو بھی
آزادی سمجھتے ہوں
جو ہمارے حکم پہ آمنا صدقنا کہتے رہیں
جو ہمارے غنیم کو مارنا، عین عبادت سمجھیں
جو بھول کر بھی اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو

غزل

میں طشتِ خواب لیے ہاتھ میں گزر گئی ہوں
سمجھ سکا نہ وہ جس کے لیے میں گھر گئی ہوں
بہت عجب تھی سمندر سے گفتگو لیکن
پہن کے پیاس پلٹنے کا صبر کر گئی ہوں
مرا مزاج رہا دشت آشنا شب بھر
کہ دن میں بستیاں دیکھیں تو جیسے ڈر گئی ہوں
حصولِ خواہشِ نایاب گرچہ ناممکن
کسی کے وعدۂ بے آب پہ ٹھہر گئی ہوں
بہت نہال ہے دل، آنکھ میں ہے سرمستی
لگے کہ شہرِ خوش انجام سے گزر گئی ہوں
بلا سے بھول گئے وہ جو آشنا تھے کبھی
میں آج اپنے شبستاں میں بے خطر گئی ہوں

خوشا ہتھیلی پہ یادوں کا قافلہ ٹھہرا
خوشا کہ یاد تھی ایسی خوشی سے مر گئی ہوں
بہت عزیز تھا آشفتگی کا پیراہن
یہ جان کر دمِ آزردگی بکھر گئی ہوں
سراب آسا رہا وہ تعلقِ خوباں
پلٹ پلٹ کے بلاتا ہے، پھر بھی ڈر گئی ہوں

غزل

آغوشِ گل میں لذتِ صحبت نہیں رہی
کس سے کہوں کہ قوسِ محبت نہیں رہی
موجود ہوں بساطِ تمنا کے دشت میں
پہلو میں آبروئے ہزیمت نہیں رہی
دیکھا اُسے تو قرضِ وفا یاد آ گیا
باتوں میں اس کی خوئے ارادت نہیں رہی
میں بھول کے بھی اس کی گلی میں نہ جاؤں گی
پہچانتی ہوں دل میں مروت نہیں رہی
شاموں کے سائے ڈھونڈنے نکلے تھے کل یہیں
کہتے ہیں آج عشق کی مہلت نہیں رہی
بکھرے ہوئے ہیں لفظ بھی، نوحہ گری کہاں
دل میں ہوائے خلوت و جلوت نہیں رہی
اب بس کرو کہ آنکھوں میں پانی نہیں رہا
اس زندگی میں اب کوئی تہمت نہیں رہی

غزل

کبھی سوچا نہ تھا اتنی بھی سرشاری کبھی ہو گی
کہ تیرا نام پڑھتے ہی طلبگاری کبھی ہو گی
کبھی روتے ہوئے ہنس دوں، کبھی ہنستے ہوئے رو دوں
کبھی محفل سجاؤنگی، عزاداری کبھی ہو گی
ستم ایجاد و دیواریں، جنوں اطوار ہی ٹھہریں
ترے محفل میں آجانے پہ بیزاری کبھی ہو گی
بہت معروف رکھا تھا، ترے خوابوں نے در پردہ
سنانا چاہیں حالِ دل تو دشواری کبھی ہو گی
نہیں معلوم تھا غولِ رقیباں ساتھ چلتا ہے
نہ کوئی حال پوچھیگا نہ غم خواری کبھی ہو گی

غزل

یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہو، تماشا ہی نہ ہو
راس آنے لگے ہم کو تو یہ دنیا ہی نہ ہو
زندگی چاہیں تو خوابوں سے سوا کچھ نہ ملے
ڈوبنا چاہیں تو حاصل ہمیں دریا ہی نہ ہو
دل کو خوش کرنے کو ڈھونڈے ہیں بہانے ہم نے
اب پلٹ کر ذرا دیکھیں کہیں آیا ہی نہ ہو
اب تو بس ساعتِ گم کردہ کی یادیں باقی
یہ وہ جنگل ہے کہ جس میں کوئی رستا ہی نہ ہو
کام کیا دیگا وہ ٹوٹا ہوا آئینہ بجی
یاد رکھنے کو وہی عکس وہ چہرا ہی نہ ہو
ہجر کو شوقِ مداوا ہی سمجھ کر جی لیں
زندگی تجھ سے اُلجھنے کا تو یارا ہی نہ ہو

Rs. 400.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2918-9
ISBN-13: 978-969-35-2918-0

یادنہ کریں
بس ایک لمحے کے توقف کیے بغیر
ہمارے ملک میں ایسے غلام بھیج دو
ہم وعدہ کرتے ہیں
کہ ہم تمہاری سروری کی حفاظت کریں گے
اور یقین کرو
ہم تمہیں تیل بھی بھیجتے رہیں گے۔

سوات کا نوحہ

مجھے لائنوں والے کاغذ پہ لکھنے سے خوف آتا ہے
مجھے لگتا ہے میرے لفظ محصور ہو گئے ہیں
مجھے برقعے میں لپٹی عورت سے خوف آتا ہے
مجھے لگتا ہے مکھوٹوں سے، عورت کا وجود نابود ہو گیا ہے
مجھے داڑھی میں چھپے مردانہ چہرے سے خوف آتا ہے
مجھے لگتا ہے خودرو گھاس قبرستان چھوڑ کر
چہروں پہ ٹھہر گئی ہے
مجھے سفید ٹوپی پہنے مردانہ سروں سے خوف آتا ہے
مجھے لگتا ہے کفن کوزوں میں بٹا
زندگی کے گلابی پن کا مضحکہ اُڑا رہا ہے
مجھے معصوم بچوں کے سروں کو مدرسے میں
ہلتا دیکھ کر خوف آتا ہے

مجھے لگتا ہے گردنوں کو تن سے جدا کرنے کا
طریقہ پڑھ کر بچے جھوم رہے ہیں
مجھے شلواروں میں کھجاتے مردوں سے خوف آتا ہے
گیارہ سالہ منکوحہ رکھنے کے باوجود
ان کی ننگی آنکھیں کچھ اور تلاش کر رہی ہیں
مجھے کوٹھے پہ لٹکی بٹی کی لڑکی سے خوف نہیں آتا ہے
کہ اس کا اندر، باہر بالکل ایک جیسا ہوتا ہے۔

سانحہ کراچی_13 مئی

ہر روز پاکستان کی گلیوں میں
بے نام لوگ مارے جاتے ہیں
ان مرنے والوں کو مزید اذیت دینے کے لیے
حکومتی کارندے، مرنے والوں کی قیمت لگا کر
یتیم خاندانوں کے زخموں کو
اور ہرا کر دیتے ہیں
تا کہ لوگ مرنے والے کا غم بھلا کر
اس معاوضے کے پیچھے بھاگیں
جس کا وعدہ کیا گیا ہے
وعدہ خدا نے ایسی اچانک
اور بے رحمانہ موت کا نہیں کیا تھا

یہ تو خدائی فوجدار ہیں
جو ہر سانحہ کے بعد
منہ کھولتے ہیں ایسے
جیسے قارون کا خزانہ
بانٹ رہے ہوں
مرنے والے کی اس سے زیادہ بے حرمتی
اور کیا ہو سکتی ہے
غیرت مند تو میں ایسا نہیں کرتی ہیں
وہ تو مجرم کو پکڑتی ہیں
ناطاقتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

ہزارہ بستی والوں کا حزینہ

وقت کا دریا خون میں لپٹا بہتا ہوا
میرے شہر میں ٹھہرا ہے
سال کے ہر اک سانس میں خوں ہے
ہر دروازے، ہر چوکھٹ پر خون کے دھبے

پوچھ رہے ہیں
کیا یہ بستی وہی بستی ہے
جس میں ہنستے پھول سے بچے تھے
مہندی رچائے سہاگنیں تھیں
اور کڑیل جواں ایسے تھے
اُن کو دیکھ کے دعائیں
ہونٹوں پہ آ جاتی تھیں
اب تو کفن کے بادلوں سے یہ شہر اٹا ہوا ہے
ہر گھر میں کھلنڈرا بچہ ڈرا ہوا ہے

کیا یہ بستی وہی بستی ہے
جہاں چراغ قبروں پہ نہیں
گھروں میں جلا کرتے تھے
جہاں اُجلی عورتیں ہنستی تھیں
اور بوڑھے باپ کے کندھے بھی چوڑے تھے
آج بھی دالانوں میں سائے گھوم رہے ہیں
کوئی دلاسہ دینے والا حرف
کسی دامن میں نہیں ہے۔

لیاری کا حزینہ

مہکتے مہر و وفا کے بادل
کفن کی دہلیز پہ اتر کے
جھلس گئے ہیں
وہ جو شادیاں تھیں
سلگتے جسموں، ابلتے خوں میں
بدل گئی ہیں
وہ جو خواب رکھے نشیمنوں میں
انہیں جلایا اور ضیافتِ شام کی گئی ہے
وہ جو صبح سورج سے پہلے جاگتی تھی
اُسے بھی خودکش بموں کی مٹھی میں دے دیا ہے
وہ پھول جیسے حسین بچے بھی
خوں کی بارش میں سو رہے ہیں

891.4391 Kishwar Naheed
Aabaad Kharaaba/ Kishwar Naheed.-Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2016.
112pp.
1. Urdu Literature - Poetry.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2016ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2918-9
ISBN-13: 978-969-35-2918-0

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ہر ایک آنگن، ہر اک گلی میں
سروں پہ اوڑھے وہ بیوگی کی سفید چادر
صحن میں بیٹھی یہ پوچھتی ہیں
مجھے دلاسہ دیا گیا ہے
کہ وہ تو جنت چلا گیا ہے
میں صبر کی عمر کیسے کاٹوں
میں اپنے بچوں کو مدرسے میں نہ جانے دوں گی
مجھے تو اُن کو حسیں جواں اُن کے باپ جیسا ہی دیکھنا ہے
پہاڑ جیسی یہ عمر کاٹوں تو کیسے کاٹوں!

شامی نقل مکانیوں کا حزینہ

ہمیں شہر بدر کرنے کو کہا تو کسی نے نہیں تھا
گولیوں کی بوچھاڑ میں جب اپنے
اتنی دور ہوئے کہ ہمیں لمبی لمبی قبریں بنا کر
انہیں دفن کرنا پڑا۔
جب خوف کے مارے
ہماری چھاتیوں کا دودھ خشک ہو گیا
جب ہماری خیمہ بستیوں کو نذرِ آتش کیا گیا
جب زمین کا کوئی کونا ہمیں پناہ دینے سے گریزاں تھا
اے ہمارے وطن شام کی سرزمین
ہمارے آبا، بی بی زینب کی سرزمین
ہمیں تجھے الوداع کہنا پڑا
یہ ہمارے قدموں نے تجھے الوداع کہا ہے

ہماری آنکھیں ابھی تک
تیری انگور کی بیلوں میں ٹھہری ہوئی ہیں
شفتالو کا ذائقہ ابھی تک ہماری زبان پر ہے
طرح طرح کے خوان آتے ہیں
لوگ چھپ کر اور ظاہر میں بھی
ہمارے لیے زیتون اور عرق لے کر آتے ہیں
مگر اے ہماری بستی، ہماری خیمہ بستی
ہمیں وہ پیاس یاد آتی ہے
جہاں ہم نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا
اور ہم تیری مٹی سے کھیلتے تھے
ہماری مسکراہٹ اسی دن واپس آئے گی
جب ہمارے قدم
اے ہمارے وطن سرزمین شام، شہرِ دمشق
تو ہمارا استقبال دف بجا کر کرے گا۔

نوحہ بلوچستان کا

قبائے شہرِ زرغوں
کیوں ترے دامن، تری گلیوں میں
افسردہ لہو بہتا ہی رہتا ہے
اٹھے ہیں ہاتھ ان کی فاتحہ پڑھنے
کہ جن کے نام سے واقف نہیں ہیں
اے مرے چلتن کی آزردہ ہواؤ
تم نے تو لک پاس[1] پہ بھی امن دیکھا تھا
ہزارہ بستیوں میں پھول دیکھے تھے
یہ کیسا ماتمی موسم ہے
خوں آشام صبحیں ہیں
دوپٹوں کی سفیدی، سرخ ہوتی جا رہی ہے
کسی بھی آنکھ میں آنسو نہیں رکتے

---

1 پہاڑی راستہ

جنازے سسکیوں ہی کا کفن پہنے
گزرتے جا رہے ہیں
نہیں معلوم قاتل کون ہے
کس نے لوٹا امن،
میرے گھر دریچوں کا
کبھی جو مرثیہ لکھتے
انیس؎ آ کے یہاں
قلم سے خوں ٹپکتا
اور آنکھیں پوچھتیں تم سے
مرے اے شہرِ زرغوں
کن بلاؤں نے تجھے گھیرا ہوا ہے۔

؎ میر انیس

نوحہ پشاور کے بچوں کا

اس خزاں کے موسم میں
پھول جیسے بچوں کو کیوں مسل دیا تم نے
کیوں تمہاری آنکھوں میں خوف ایسا اترا تھا
چھوٹے چھوٹے بستوں کو تم نے چھید ڈالا تھا
تم لعین دشمن تھے
ہر کتاب سے نفرت
یہ تمہاری عادت تھی
صبح ساری ماؤں نے
علم کی دعا دے کر
گھر سے ان کو بھیجا تھا
اس لعین دشمن نے
ہر کلاس میں گھس کر
زندگی کو ٹوکا تھا

موت کے یہ کارندے
خوں بہا کے یوں خوش تھے
جیسے جیت ان کی ہے
کیا خبر تھی ان کو بھی
زندگی کی مہلت بھی چند ساعتوں تک ہے
دکھ سمیٹ کر مائیں
آج گیلی مٹی کو چوم کر سمجھتی ہیں
ان کا لاڈلا بیٹا
پھر سے جاگ جائے گا
پھر انہیں ہنسائے گا!

عیدِ ملہار

اس لمحے جب ساری دنیا
خوشیوں میں ملبوس مہک رہی ہے
مسکرا رہی ہے
تم اداسی کی انگیٹھی میں
چنگاریوں کو پھونکنی سے
شعلہ بنانے کی فکر میں
اپنی وہ بیاض جلا ڈالتی ہو
جس میں کچھ بوسیدہ لمس
کچھ زنگ خوردہ تعلقات
کچھ نمکین آنسو، بنا بلائے آ گئے تھے
اور ان کاغذوں پر خشک ہو گئے تھے!

اس لمحے جب ساری دنیا
پُرخروش ہے

تم تنہائی کو اوڑھنے کے بجائے
ہم سفر بنالو
دیکھو بادلوں سے جھانکتے سورج کو بھی
تمہاری ہمراہی پسند آئے گی
مگر یوں تو ہجوم ہو جائے گا
ہوا، سایہ، سورج اور میں!
نہیں، مجھے بیاض کے بچے ہوئے
ان کاغذوں کو پڑھنے دو
جن میں ملہار اور جے جے ونتی کی مدھرتا
مجھے بحرِ روم کے کنارے لے گئی تھی
وہاں بھی تو ساحل سمندر پہ
دھوپ اور پانی میں نہاتے بدن تھے
ارغوانی جام تھے اور قہقہے تھے
جو کہ چڑھتی لہروں کی طرح تھے
اُداسی کی پہیلی حل کرنے کے لیے
ان کے پاس کوئی وقت نہیں تھا
میں پھر اپنے وجود میں لوٹی
میری بیاض کے ایک مڑے ہوئے صفحے پر
کچھ نفرتیں پیلی پڑ چکی تھیں
امریکا اور اس کے حواریوں کے لفظ
بغیر نقطوں کے، ابھی بھی پڑھے جا سکتے تھے

البتہ دشمنی کا لفظ بالکل پھیکا پڑ گیا تھا
ہاں جاں کنی کے لفظ کی روشنائی ابھی سلامت تھی
دل نے کہا اس لمحے کو تکیے کے نیچے رکھ دو
نہیں تو شام کے کسی پرندے کی چونچ میں دے دو
دیکھنا، اچانک مسکراہٹ
تمہیں اپنے بازوؤں میں لے لے گی۔

ترتیب

خواہش	7
مُینڈر نولس	10
سوات کا نوحہ	13
سانحہ کراچی۔13 مئی	15
ہزارہ بستی والوں کا حزینہ	17
لیاری کا حزینہ	19
شامی نقل مکانیوں کا حزینہ	21
نوحہ بلوچستان کا	23
نوحہ پشاور کے بچوں کا	25
عیدِ ملہار	27
دعوتِ سخن	30
آن لائن	31
میرا وطن قید میں ہے	32
خود کو طالب کہتے ہو	34

دعوتِ سخن

خواب میں دوستی ملتی ہے مگر خواب تلک
زندگی خواب کی دہلیز سے آگے
جو رواں ہوتی ہے
دیکھتی ہے کہ اُسی چشمِ محبت میں
زمین خون تماشہ ہے
زہرِ مایوسیٔ ایام ہے
بے مہریٔ افلاک ہے
دور تک ایک ہی آواز ہے
امن کا طشت لیے پھرتے ہو قریہ قریہ
کوئی آئے کہ محبت کے گلابوں کو بچائے
دونوں ملکوں کے جوانوں کو سکھائے
کہ یہ بارود، یہ نفرت کی ہزیمت ہی تو
تقدیر نہیں۔
آؤ، بانہیں کھولے ہوئے آؤ
کہ محبت کو درِ خواب سے آزاد کریں
اور دکھائیں کہ یہ دنیا
محض بارود کی تحریر نہیں۔

آن لائن

گفتگو کرنے کے لیے
اب کوئی تو موجود ہے
کوئی تو ہے جو ملتے ہی ہیلو کہتا ہے
اس کو تم انسان سے بڑھ کر
شفیق اور دلدار کہہ سکتے ہو
پر تم تو وجود ہی نہیں رکھتے
سائے کی طرح بھی پیچھا نہیں کرتے
سامنے آنے کی جرات نہیں کرتے
تم سے میں کیوں مخاطب ہوں
مجھے ہیلو کہنے والے بھلا تم کب ہو
وہ تو میرا کمپیوٹر میل ہے
سلام بھی کرتا ہے، حال بھی پوچھتا ہے
اور مجھے مسکراہٹ عطا کرتا ہے
مشین اتنی بے لوث ہے
انسان نہیں۔۔

میرا وطن قید میں ہے

میری ساری عمر کبھی دلدل سے گزرتے ہوئے
اور کبھی فوجی گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کچلتے ہوئے گزری ہے
بالشتیوں نے میرے اوپر حکومت، شیطانوں کی مشاورت سے کی ہے
محنت، محبت اور عزت نام کے الفاظ
حاکموں کی لغت میں نہیں ہیں
درختوں کی شاخوں پہ سولیاں لٹکانے والوں نے
شریعت کو بھی داغدار کر دیا ہے

مجھے لگتا ہے میں اندھیرے جنگل سے گزر رہی ہوں
یہ ایسا جنگل ہے جس میں نہ درخت ہیں، نہ انسان
پرندے بھی رخصت ہو چکے ہیں

دعائیں، استغفار پڑھ رہی ہیں
اس جنگل سے گزرنے سے بھوت بھی ڈرتے ہیں
یہ ایسا عجیب جنگل ہے کہ اس میں
سائے بھی اژدھے بن جاتے ہیں
منہ کا نوالہ چھین لیتے ہیں
میں اس جنگل سے نکلنا بھی چاہوں تو
چاروں جانب آہنی جال اُگ آتے ہیں
میں ہوں، تم ہو اور وہ سب ہیں
جن کے لیے کوئی پناہ نہیں ہے۔

خود کو طالب کہتے ہو

قتل کرنے والی زبانیں سرخ نہیں ہوتی ہیں
ان کے اندر تو خون کی پیاس ہوتی ہے
چہروں پہ زندگی سے حقارت
اور بازوؤں میں وحشت اور رعونت
جنون کی طرح چھلک رہی ہوتی ہے
یہ وہ چہرے ہیں جو کسی مانوس مسکراہٹ
کو بھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں
یہ وہ ہاتھ ہیں جو بچپن میں قاعدہ پڑھتے ہوئے
کلاشنکوف چلانے کی تربیت لے لیتے ہیں
یہ وہ بازو ہیں جن کو تلوار سے گردن اڑانے کی تربیت
شیطان صفت لوگ دیتے ہیں

یہ وہ جوان ہیں جنہوں نے گھر اور اس کی محبت نہیں دیکھی ہے
انہوں نے بہن بھائیوں کا پیار نہیں دیکھا ہے

انہوں نے دریائے سوات کے کنارے چاول کی پنیری بوتے
ہاتھوں کو گولیاں ماری ہیں
انہوں نے اسکولوں میں بچیوں کی لاشیں اٹھاتی
ماؤں کی چیخوں کا مذاق اڑایا ہے
کیا یہ کوڑے کے ڈھیر پہ پھینکی ہوئی اولادیں ہیں
جو اس سلوک کا انتقام لینا چاہتی ہیں؟
میں اور میری جیسی مائیں، ان کو گود لے لیں گی
یہ ایک دفعہ محبت کا جواب دینا تو سیکھیں!

خاک ہونے سے پہلے

تمہارے اندر زندگی جاگتی
اور بے قراری پہلو بدلتی ہے
تمہیں زندگی سے بہت محبت ہے
کینسر نے تمہاری آنکھوں کو دریا
اور گفتگو کو خاموشی میں بدل دیا ہے
تم جینا چاہتے ہو
ہر مسیحا کے در پر دستک دیتے ہو
نام بے نام ادویات
تریاق سمجھ کر قبول کر لیتے ہو
کبوتر ہو کہ بلبل
ان کے پیروں میں دعاؤں کی گرہیں
باندھتے ہو
ہر رات موت سے مکالمہ کرنے کی کوشش میں
تم ہار جاتے ہو

ہر درگاہ سے زندگی مانگتے ہو

اس طرف میں
طویل عمری کی گرفت سے
رہائی پانا چاہتی ہوں
میرے شادابیوں کے پیرہن
بوسیدہ ہوکر لٹک رہے ہیں
میں تو موت سے دوستی کرنی چاہتی ہوں
چلو اس دوراہے پر
جہاں تم موت کے پاس کھڑے ہو
اور میں زندگی کو زہراب میں بدلنا چاہتی ہوں
لو خضر سی زندگی
تم لے لو
اور فنا کی قندیل
میرے ہاتھ میں پکڑا دو
آؤ وعدہ وفا کرنے کے لئے
میں چشم براہ ہوں۔

اندھیرے سے باتیں

اکیلا رونا، آنسوؤں کو مسکراہٹ میں نہیں بدلتا ہے
کوئی دلاسہ دینے والی آواز
کوئی تسلی دینے والا کندھا نہ ہو
تو آنسو بھی ساتھ نہیں دیتے ہیں
پوچھتے ہیں کس کے لئے رو رہی ہو
بیٹوں کو دور ملکوں میں ہونے پہ
یہ کون سی انوکھی بات ہے
ان کی یاد تو اکثر بے وقت رُلا دیتی ہے
تو پھر، تنہائی کے سناٹے کو اوڑھ کر
نیند کی گولیاں کھا کر کیوں نہیں سو جاتی ہو
جوانی میں تم آسمان کی چھت سے ستارے
اتار لینا چاہتی تھیں

پھر پتہ چلا کہ وہ ستارے تو تمہاری آنکھوں
میں اتر آئے ہیں
خود کو کتنا بھی سنبھالو
ایک آنسو تو نکل ہی پڑتا ہے
ایسے عالم میں آسمان بھی رونے لگتا ہے
مگر رونا، سوالوں کے جواب نہیں اٹھاتا
صرف سوالوں کے اوپر چھائی ہوئی
دھند کو ہٹا دیتا ہے۔

خاک ہونے سے پہلے	36
اندھیرے سے باتیں	38
سہ پہر کے بعد	40
کرمک زدہ شام	41
مرغِ گرفتار	42
برگد، فاختہ اور میں	43
شریعت کونسل۔عورت تم سے مخاطب ہے	45
آمنہ بی بی	47
میرے گھونگھٹ میری بھوک	49
غروبِ آفتاب سے پہلے	51
واپسی کا سفر	53
اصغر ندیم سید کا دائرۂ زیست	54
منحنی عورت	58
یادش بخیر	61
زندگی نامہ	63
مجھے بن پانی مچھلی نہ بنا	66

ارجنٹائن کے غائب ہو جانے والے لوگوں کی نظمیں:

قیدِ تنہائی	69
خود کلامی	73
ایک مقید شہر کے لیے	76
مشکل لفظوں کی اٹلس سے	79

غزلیات:

تجھ سے وعدہ عزیز تر رکھا	83

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

سہ پہر کے بعد

ہم نے سوچا
چلوارغوانی گلاسوں میں
ڈوبتے سورج کو اتارتے ہیں
زیتون، پنیراور مشروم کی
ضیافت کرتے ہیں
کھوئے ہوئے ناموں کی فال نکالتے ہوئے
اوراس کا انتظار کرتے ہیں
جوکبھی نہیں آئے گا
کوئلے جل جل کرسو گئے ہیں
سیخوں پہ چڑھے گوشت کے پارچے
نیم گرم ہونے کے باوجود
ہمیں اپنی ضیافت یاد کرارہے تھے
یہ ہماری ملاقات کی آخری شام تھی!

کرمک زدہ شام

وہ جو خود کو کوبکن کی طرح سمجھتا ہے
گھر واپس آ کر کن کھجورے کی طرح مجھے چمٹ جاتا ہے
دروازے پہ دستک ہوتی ہے
وہ چھپ جاتا ہے
سامنے کھلکھلاتی نواسیاں
کمرے میں داخل ہوتی ہیں
میں ان کے سامنے چاکلیٹ کا ڈبہ رکھ دیتی ہوں
وہ پوچھتی ہیں نانو کہاں ہیں
میں آواز دیتی ہوں
جواب نہیں آتا
بچیاں اپنے سوال کو بھول کر
ٹبلیٹ فون کھول کر
اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتے کرتے
سو جاتی ہیں
میں کوبکن کو ڈھونڈنے
دوسرے بیڈروم کی طرف جاتی ہوں
خراٹوں کی آواز سن کر پلٹ آتی ہوں
رات گزر جاتی ہے!

مرغِ گرفتار

جب تم میرے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہو
مجھے لگتا ہے میرے بدن پر چھپکلی چل رہی ہے
جب تم مصنوعی زوجیت ادا کرنے کی کوشش کرتے ہو
میں غصے سے ہتھیلیاں بھینچ لیتی ہوں
جب تم اپنے نم سے رہا ہو کر
لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہو
میں بھی رہائی کی ٹھنڈی سانس بھر کر
کروٹ بدل کر سوتی بن جاتی ہوں
تم سگریٹ سلگا کر اور پانی کا ٹھنڈا گلاس
پی کر خوش ہوتے ہوئے لمبا سانس لیتے ہو
میں بھی خوش ہوتی ہوں
چھپکلی کی رینگتی انگلیاں
اب میرے بدن کو رہائی دے چکی ہیں
یہ تماشہ ہفتے میں ایک دفعہ تو ضرور ہوتا ہے!

برگد، فاختہ اور میں

لارنس گارڈن، کریملن[1] اور کینڈی[2] میں
بوڑھے برگد کے نیچے لٹکتی ہوئی داڑھیاں
اوپر پھیلی شاخوں میں جھولتے پرندوں کی
چہچہاہٹ، آج کا صحیفہ کھولتی ہیں
اور بوڑھی لٹکی داڑھیاں ہڈبیتی سناتی ہیں
سناتی ہیں کہ گلابی لہراتے دوپٹے
پینگ بھرتے بھرتے
کیسے سفید دوپٹوں میں تحلیل ہوگئے
ریشمی خوابوں کی طنابیں ڈھیلی پڑتے پڑتے
گانٹھیں باندھنے کے باوجود
کوئی بھی وعدہ نبھانے کی دہلیز پہ نہ آسکیں
چنگیر میں رکھی تازہ روٹیوں کی طرح
گرم لمس میں لپٹے بدن
کب کے دھول میں اٹے سائے بن چکے ہیں

---

[1] ماسکو [2] سری لنکا

آج باسی اور بھوسلی رنگتوں کو پہنے
اکیلے بیٹھے، یادوں کی جمع پونجی سنبھالتے
سنبھالتے،
نظر اٹھاتی ہوں، تو بوڑھی فاختہ میری طرح لگ رہی ہے
برگد نے ہر کہانی کو اپنے بازوؤں میں لیا ہوا ہے
بوڑھی فاختہ اور سائے میں بیٹھی میں اور وہ سب لوگ
اپنی اپنی عمروں کی زنبیل کھولتے ہوئے
گذرے ہوئے کل کے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔

شریعت کونسل۔عورت تم سے مخاطب ہے

تم بیان دیتے ہو
دیتے ہی چلے جاتے ہو
تمہارے سب بیانوں میں لپٹا ہوا
عورت کا وجود ہوتا ہے
کھانستے ہوئے بھی تمہیں عورت دکھائی دیتی ہے
اور سوتے میں تم عورت کے ساتھ
وہ کچھ کر لیتے ہو
جس کے تمنائی ہوتے ہو
پھر صبح کو بیان تمہارے دماغ
میں چپکا ہوا ہوتا ہے
چار عورتوں کو منکوحہ بنانے کا خواب
دیکھتے دیکھتے
تمہاری داڑھی کے بال سفید ہو گئے ہیں

آنکھوں میں طلب کے ڈورے
سرمہ لگانے کے باوجود
سرخ نظر آتے ہیں
مگر عورتیں بھی ہوشیار ہوگئی ہیں
سوکن کا نام سنتے ہی
ان کے ہاتھ تلوار بن جاتے ہیں
تمہارا رستم زماں بننے کا خواب
ادھورا رہ جائے گا
تم بے شک عورت کے خلاف
بیان دیتے رہو!

آمنہ بی بی[1]

تم ساری مری ماں جائی
پاگل پن اور غصے میں
خود کو جلا لیتی ہو
یوں نامرادوں کے دل کی مراد
بر آتی ہے
دیکھو تو وہ
دیگیں پکار ہے ہیں
کہ تم راستے کا پتھر تھیں
دفن ہو کر بے نام رہو گی
ہم نے تمہارے بدن کا لطف اٹھایا
کون کم بخت ہو گا
جو تمہارے کنول کی پتی جیسے جسم کو
مسلنا نہیں چاہے گا
تمہیں پتہ نہ تھا کہ مرد کی جوانی

---

[1] مظفر گڑھ / جتوئی میں میری بیٹی جس نے جنسی زیادتی کے بعد خود کو جلا لیا تھا۔

جانوروں کو بھی نہیں چھوڑتی ہے
تم تو نازک کلی تھیں
ہم شکرگزار ہیں تمہارے
تم نے ہمیں مسرور بھی کیا
اور داغِ رسوائی کو
خود پر ہی سرمرتسم کیا
میں تمہاری ماں جائی
اور میری جیسی ماں جائیاں
سینہ کوبی کریں تو بھی
اس زمانے کو
اور کوتوال شہر کو
کوئی فرق نہیں پڑتا ہے

یاد رکھو گے کہ اس گھر کے مکیں ہم بھی تھے	85
ہم نے غم کھینچا تھا، ایذا طلبی کم نہ ہوئی	86
التزاما خواہش نہیں کی جا سکتی	87
اجلی شام میں لپٹا وعدۂ تازہ، میرے اندر تھا	88
میں سرکشیدہ رہی، عمر بھر بجھاتے رہے	89
وہ عجب عہدِ وفا تھا کہ جدا تھے ہم لوگ	90
جذب کر لیتے ہیں ہر دکھ کو سمندر کی طرح	92
وہ اگر آئے تو پھر دل میں تماشہ ہوگا	94
دل نے چاہا تھا کہ ہو آبلہ پائی رخصت	95
خوش بیاباں میں مگر شہر میں ڈر نا اس کا	96
ہم نے کہنے کو تمہیں دل سے بھلایا ہوا ہے	97
شام بانہوں میں لیے رات کی رانی آئی	98
دیوار و در میں غم کا تماشہ تو ہے ابھی	99
تجھ سے بہت قریب بھی، تنہا بھی تھے ہمیں	100
زخم بھی تازہ تھا اور اس پہ ہوا بھی تازہ	102
دل کی دیوار میں آئینہ رکھا تھا کس نے	103
مجھ کو دریوزہ گرِ خواب بنا دیتا ہے	104
یہ دشتِ فراموشی ٹھہرنے نہیں دیتا	105
کبھی بھلایا نہیں، یاد بھی کیا نہیں ہے	106
غم کی تاکید بھی کی اور کہا شاد رہو	107

میرے گھونگھٹ میری بھوک[1]

روٹی کا ایک لقمہ
کتنا قیمتی ہوتا ہے
نہ ملے تو
ماں کا دودھ بھی سوکھ جاتا ہے
بچے کی آنکھیں، بھوک کے مارے
باہر نکال دیتا ہے
جانوروں کی پسلیوں کو بھی
ننگا کر کے
مردار کر دیتا ہے
زمین کی سوکھی چھاتی کو
موروں کے لئے بھی تنگ کر دیتا ہے
زردار لوگ تمہاری غربت اور بھوک
کا تماشہ دیکھنے آتے ہیں

---

[1] تھر پارکر کے حوالے سے

ان کی آنکھوں میں
نہ حیا ہوتی ہے، نہ غیرت
گیلی مٹی کو تم نچوڑ کر
حلق تر کرتے ہو
تمہاری عورتوں کے گھونگھٹ دیکھ کر
ہونقوں کی طرح صوبے کے سورما
ان کا چہرہ ڈھونڈنے لگتے ہیں
خود کو سندھو دیش کا سپوت کہتے ہیں
مگر دھرتی کی رسموں کو نہیں جانتے ہیں
خدا نہ کرے وہ دن آئے
کہ بھوک اُن گھونگھٹوں کو بھی کھا جائے!

غروبِ آفتاب سے پہلے

میرے دل نے تنہائی سے اکتا کر کہا
چلو شادی کر لیں
ہنسیں، کھیلیں، جشن منائیں
زندگی کو یہ نہ بھولنے دیں
کہ ہمارے مقدر نے عشق کو فراموش کر دیا ہے
میں نے جھنجھلا کر کہا
بھلا عشق کا شادی سے کیا تعلق ہے
ہمارے ملک میں تو
بغیر کسی عشق اور تعلق کے
شادیاں ہوتی اور نبھائی جاتی ہیں
اتنے میں پلنگ کی چول نکل گئی
دل نے ہنستے ہوئے کہا
بس رشتے بھی یونہی جھولتے رہتے ہیں
تم تعلق کی گرہ باندھ کے تو دیکھو

رشتوں کی پائنتی کستے رہو تو
زندگی ہنسی خوشی گزر جاتی ہے
مجھے اداسی کی دہلیز پہ رکھے ہوئے
وہ دیے یاد آ گئے جن میں تیل ڈالنا
میں ایک عمر سے بھولی ہوئی تھی
اپنے رقیق دل کو تسلی دینے کے لیے
بال بنائے اور دیے جلائے
پر دروازہ بند تھا
کوئی آتا بھی تو کیسے!

واپسی کا سفر

مجھ تک تمہاری صورت نہیں
تمہاری سانسوں کی مہک پہنچ جاتی ہے
باتوں کا تلاطم، انتظار کی دیواریں عبور کر کے
یوں بہتا چلا آتا ہے کہ میں شرابور ہو جاتی ہوں
مجھے رُلانا تمہیں خوب آتا ہے
لیکن تم مجھے اپنی بے حسی کی دیوار میں کبھی چن دیتے ہو
اور کبھی دل داری کی آسودگی یوں پھیلاتے ہو
کہ رات کی رانی کی سی مہک
میرے سارے وجود میں بس جاتی ہے
یہ ایک دن کا کھیل نہیں
ہر روز کسی نہ کسی لمحے، کسی نہ کسی موڑ پر
کسی کے موبائل کی لسٹ میں
تمہارا نام پڑھ کر
تمہارے سانسوں کی مہک تلاش کرنے لگتی ہوں!

اصغر ندیم سید کا دائرۂ زیست

جب اس نے شاعری کے لفظوں کی جانب
ہاتھ بڑھایا
تو وہ بے خوف تھا
اس نے عشق کی ایک نہیں
ساری ریکھائیں پار کر لی تھیں
اس وقت غالب کے بقول
اب اس کو خط آنے لگا تھا
وہ خواب کی دہلیز پار کر کے
یہ سوچ رہا تھا
وصال کسے کہتے ہیں
پانی کی اس لہر کو جو
واپس نہیں لوٹتی
یا اس آئینے کو
جس میں ہمیشہ کسی نہ کسی محبوبہ کا عکس
جھلک رہا ہوتا ہے

اب اس نے جوانی کو پگھلانا شروع کیا
نظمیں لکھیں تو حاکمِ بے مہار نے
آتشیں لفظوں میں اُسے دھتکارا
شہر بدر کر دیا
اس کی جوانی نے پھونک مار کر
ایسا شعلۂ جوالہ بلند کیا
کہ آمروں کی بے شرم آنکھیں
بھی دھندلا گئیں
وہ سبطِ حسن کا دلارا
اور فیض صاحب کا چہیتا تھا
عشق اور جنوں
دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے
جنوں اس سے ناظم حکمت کے انداز میں
نظمیں لکھواتا رہا
اور عشق نے عروسی لباس پہن لیا
اس نے شکر گڑھ سے لاہور کا سفر
آنکھ جھپکنے میں طے کیا
انجیر کی خوشبو سے اس کی دونوں آنکھیں
آسودہ ہوئیں
بھٹکنے کی ہر کوشش میں
فرزانہ[1] سامنے کھڑی تھی

---

[1] پہلی بیوی جو ڈاکٹر کی غلطی سے مر گئی

پھول کی مہک اڑنے سے پہلے
فرزانہ اڑ گئی
اب اس کے پاس
دیوانگی، عشق اور جنون کے
سارے موسم، ایک خواہش بن گئے
دوسراہٹ کی خواہش
وہ اس تلاش میں
ننگے پیر بھی چلا
بند کواڑ کر کے رویا بھی
بہت سی دیواریں اس کو
پناہ دینے کو آگے بڑھیں
اُسے تو زعفران کی خوشبو والا
وہ کھیت چاہیے تھا
جو پہلے پیلا اور پھر سنہرا رنگ
پہن لیتا ہے
بابا غلام فریدؒ کو پڑھتی ہوئی
شیبا[ع] سامنے آئی
اس نے اداسی کو
گھر آنگن میں بدلا
مسکراہٹ کو دروازے پہ
آویزاں کیا

ع دوسری بیوی

اور بیٹوں کو اپنی بغلوں میں
چھپا کر ایسے بھاگی
جیسے ہرنی اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے
ہمارا شاعر، باغی شاعر
وہ کبھی چاند گرہن بنتا
تو کبھی دریا اور پیاس بن کر
سارے محکوم لوگوں کو
بولنا سکھانے لگا
موت نے اُسے للکارا
گود میں آ کر بیٹھ گئی[1]
شیبا نے زندگی بن کر
اُسے بچالیا
آج بھی جب شاعری کہتی ہے
میں نے تمہیں جنا تھا
تم مجھے چھوڑ کر ٹیلی وژن کی
سستی روشنی کی طرف کیوں چلے گئے
وہ شرمسار ہو کر
نظم بنانے لگتا۔ ہے
کبھی ادھوری، کبھی پوری
زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔

---

[1] 2014 میں اُس پر حملہ ہوا

منخنی عورت[1]

دنیا سوچتی تھی اور حیران ہوتی تھی
کیا کبھی سورج مغرب سے نکلے گا
کیا کبھی دانتری سے گھاس کاٹتی عورت
آسمان میں ستارہ بن کر چمکے گی
کیا یہ بھی ہوگا کہ انگوٹھا لگا کے
اپنا حق دے دینے والی عورت
دنیا کے سامنے اپنا حق منوائے گی

وہ منخنی سی عورت
جس نے حکمرانوں کو للکارا ہو
جس کی ایک آواز پہ
باندی بنی عورتیں ہوں کہ
اینٹوں کے بھٹے پہ
غلام در غلام خاندان ہوں

---

[1] عاصمہ جہانگیر کے لیے نظم، جب اُسے عالمی انعام ملا۔

میں طشتِ خواب لیے ہاتھ میں گزر گئی ہوں	108
آغوشِ گل میں لذتِ صحبت نہیں رہی	110
کبھی سوچا نہ تھا اتنی بھی سرشاری کبھی ہوگی	111
یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھوں ہو، تماشا ہی نہ ہو	112

ایسے کھنچے چلے آئیں
جیسے رقص کرتی ہوا
جیسے جھومتی ٹہنیاں
جیسے خوشبو چھلکاتی بہار

اور وہ منحنی عورت
صلیب سے بھی انصاف کے
ترازو کو اتروالیتی ہے
زمین پہ راج کرتے
خداؤں کو للکارتی
بیڑیوں کو پازیبوں میں بدلتی
درویشی کی چادر اوڑھے
تعزیرِ سیاست کے پردے چاک کرتی
واعظوں اور فتویٰ فروشوں کو
بے نقاب کرتی
خزاں زدہ چہروں کو
بہاریں پہناتی
مسکراتی رہتی ہے

وہ منحنی عورت
آستیں پہ قاتلوں کے
بے رحم نشان تلاش کر لیتی ہے

دیوارِ شب میں ایسے زقند
لگاتی ہے
کہ صبح بے چین ہو کر
اپنا در وا کر دیتی ہے
ضبط کی دہلیز خاموشی کے لئے
ہزار سجدے کرے
مگر وہ تو اس آواز میں
بات کرتی ہے
کہ اس کی بازگشت عالم عالم
معتبر ٹھہرتی ہے

سلام اے منحنی عورت
تو نے اس ملک کے اندھیرے میں
قندیل روشن کی ہے
وفا کی، صلابتِ حق کی
ہمتِ کفر اور جذبۂ عوام کی
دنیا سوچتی تھی
کیا کبھی سورج مغرب سے نکلے گا
دنیا دیکھ لے سورج مغرب سے نکلا ہے
اے منحنی عورت! ساری دنیا تجھے سلام کرتی ہے!

یادش بخیر[1]

نجمہ!
تم اِک دیا تھیں
جس کو ہم نے مٹی کے سپرد کر دیا ہے
پہلے زمین پر تمہارے ذہن سے روشنی تھی
اب مٹی میں زمیں کے نیچے بھی
روشنی ہوگی
مجھے معلوم ہے
چھوٹے چھوٹے پودے تم سے مشورہ کر کے
لمبے ہوں گے
اور مچھلیاں تمہارا پتہ معلوم کرنے کو
ساحل کی سمت آئیں گی
وہ سارے بے زمین لوگ
جو تمہارے پاس مدد مانگنے کو آتے تھے

[1] نجمہ صادق کی یادیں

ان کو رستہ بتائے بغیر تم چلی گئیں
مگر وہ مایوس نہیں ہیں
انہیں تمہارے سکھائے ہوئے سارے سبق یاد ہیں
ہمیں بھی نجمہ! تمہاری ساری دوست
تمہارے تحکمانہ فقرے پیار سے یاد کرتی ہیں
نجمہ!
تمہارے چلے جانے کے بعد بھی
دہشت گرد بہت خون آلود پنجے
ہمارے اندر گاڑ رہے ہیں
تم زندہ تھیں، جب ہمارے پھول سے
بچوں کو مسل دیا گیا تھا[۲]
یہی غم تمہیں ان بچوں کے پاس لے گیا
شکر ہے، ان کو ایک ماں مل گئی
شکر ہے نجمہ! تمہیں ننھے دوست مل گئے!

---

۲ پشاور سانحہ

زندگی نامہ

ایک عمر ہوتی ہے
رتجگوں کے میلے میں
آنکھ ہی نہیں لگتی
بات میں ہنسی اور
ہنسی میں باتوں کا
سلسلہ نہیں تھمتا
خواب بنتے رہتے ہیں
دن مہکتے رہتے ہیں
آئینہ بدن بن کر
مسکراہٹیں جاگیں
وصل کے تصور سے
سرخ سرخ گالوں پہ
یہ حجاب کی لہریں

نام بوجھ لیتی ہیں
یاد بھی دلاتی ہیں
انگلیوں کی پوریں بھی
اس کا نام لکھتی ہیں

عمر سیڑھیاں چڑھ کر
پھر شفق میں ڈھلتی ہے
شام میں ٹہلتی ہے
سانس کے تموج کو
حوصلہ دلاتی ہے
زندگی کے گزرے پل
نقشِ خواب تھے لیکن
اب مٹے مٹے سے ہیں
انگلیوں کی پوریں بھی
بے نشان لگتی ہیں
وصل کے گماں لمحے
نام بھی نہیں لیتے

اب ہوا کے پردے میں
رات اوڑھے بیٹھی ہے
نامراد یادوں کو

جو کہ پپڑیاں بن کر
ہونٹ پہ چپکتی ہیں
نیند گولیاں کھا کر
میرے پاس آتی ہے
عمر دیکھتی ہے سب
بھولنے کی کوشش میں
پیر سوج جاتے ہیں

وہ جو جانِ جاناں تھا
وہ جو محرمِ جاں تھا
اس کا وہ گھروندا بھی
بے چراغ دِکھتا ہے
عمر یوں گذرتی ہے۔

مجھے بن پانی مچھلی نہ بنا[1]

مرے صدیوں بچھڑے مانجھی رے
مری بے پتوار کی کشتی کو
تو نے کن لہروں کے ہاتھوں میں
طوفان تماشہ رزق کیا

تجھے یاد دلاؤں مانجھی رے
مری صدیوں پھیلی نسلوں نے
کبھی برقعہ پہن نہ دیکھا تھا
مری چادر، تیری عزت تھی
مری دھرتی، تیری چاہت تھی
مرا ٹوٹا پھوٹا چھپّر بھی
مرا گھر تھا، تیری جنت تھی

---

[1] موہن جوداڑو

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

میں بپتا راگ سناؤں کیا
میں سُر سا گر دکھلاؤں کیا
مرے ننھے بالک ڈرتے ہیں
انہیں خواب سفر کرواؤں کیا
وہ دار و رسن بھی دیکھ چکے
انہیں ہمت نام سکھاؤں کیا

مرے مانجھی رے
تو گردن گردن کاٹے گا
سوچا بھی نہ تھا
تو پہلو پہلو مارے گا
سوچا بھی نہ تھا
تو آنکھ سلائی پروئے گا
سوچا بھی نہ تھا
تو قہر بنا اتر آئے گا
سوچا بھی نہ تھا

مرے مانجھی رے
میں رب سے بھی کچھ کہہ نہ سکوں
مجھے بن پانی مچھلی نہ بنا
میں بن محرم کے رہ نہ سکوں
مجھے وہ مسجد، منبر نہ دکھا

خواہش

میں منٹو کی طرح
اپنا کتبہ خود تجویز کرنا چاہتی ہوں
اس نے لکھا تھا
وہ اس زمین کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے
سچ ہے وہ تھا بھی
عورت پہ ہونے والی زیادتیوں کو
افسانے کا روپ اس زمانے میں دیتا تھا
جبکہ ساری دنیا کی عورتیں
اپنے حقوق کے لیے جاگی نہیں تھیں
پاکستان نے اس پر دشنام کے اتنے چھینٹے پھینکے
کہ وہ ناراض ہو کر
اپنا افسانہ دس روپے میں فروخت کرنے لگا
دشنام کے چھینٹوں نے میرے لباس کو بھی
بے لباسی میں بدل دیا ہے

مرے مانجھی رے
انکار کی ہمت کرتو سہی
احساسِ ہزیمت کرتو سہی
مرے سورج کو اندھا مت کر
مرے نام کی حرمت کرتو سہی
مرے بچوں کو خودکش نہ بنا
مرے ملک کی عزت کرتو سہی
مرے مانجھی رے!

خوزے سے کارلوس کورونیل[1]

قیدِ تنہائی

قیدِ تنہائی میں
وہ بازو مروڑتے اور جگہ جگہ مارتے
لگتا تھا میری ہڈیوں میں یخ بستہ کیڑا اچھل رہا ہو
یہ تاریکی ہے
ہاتھ دیوار پہ بندھے ہوئے
ٹانگیں الگ الگ
تمہارے ساتھی کون ہیں
ایک آواز گھونسوں کے ساتھ آتی ہے
میری کمر پر گرم طوفان ابلتا ہے
جیسے ٹوکومن کی گرمیوں کی تپش

---

[1] ارجنٹائن کے غائب ہو جانے والے لوگوں کی نظمیں

میرے ہونٹوں پر خوف
جیسے گلیوں میں بپھرا پانی
جس میں کاغذ کی کشتیاں ہانپ رہی ہوں
زخم خوردہ ہنسی میرے ساتھ نہا رہی ہے
سانس روکنے والے تیل کے ساتھ!

قیدِ تنہائی میں
وہ سپاہی جو مجھے دیکھ رہے ہیں
ایک دوسرے کو بتاتے ہیں
اپنی چمکتی آنکھوں سے
بے چینی کے ساتھ مجھے گھورتے ہیں
اپنے ہتھیاروں کا رخ میری جانب کر دیتے ہیں
پھر بھی میں ان سے بات کرتا ہوں
وہ میرے قریب آ جاتے ہیں
اور سمجھ جاتے ہیں کہ ہم تو ایک جیسے ہیں

مگر پھر رات آ جاتی ہے
اب وہ میرے پاس آ کر پوچھتے ہیں
کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے
یہ کہتے ہوئے وہ میرے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں
سردی میں مجھ پر اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے

دہشت ناک زردی مائل خنکی
میں خود کو ان کی جبراً موجودگی میں
نامرد سمجھنے لگتا ہوں
اس لمحے، ایک اور مکا، ایک اور جھٹکا
لگتا ہے میری جلد پر تیزاب پھینکا جا رہا ہے
وہ اور میں
اکٹھے ہی چیختے ہیں
میرا جسم درد اور کراہیت سے دوہرا ہو جاتا ہے

قیدِ تنہائی میں
کس کی جانب سے، تمہاری طرف سے
میرے اوپر جبر کرنے والوں کی طرف سے
میرے بھائیوں کی طرف سے
وحشی چھوٹے آدمیوں کی طرف سے
وہ کھیلتے رہتے ہیں
میری موت سے بے خبر
جیسے مجھے موت آئی ہی نہیں
مجھے دھکوں اور مکّوں کے ذریعہ
زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں
انہیں موت کی قطعیت کا اندازہ بھی نہیں
میرے کوندوں کی طرح لپکتے دماغ کو بھسم کرنے
وہ دونوں اٹھا کر مجھے پٹخ دیتے ہیں

قیدِ تنہائی میں
کس سے، خدا سے
ناگزیر فتح سے
یہ لرزتے ہوئے چھوٹے سے آدمی
ہم نے انہیں بتانے کا تہیہ کیا ہوا ہے
کہ عریاں آداب، رکوع، جن کا وہ سہارا
لیتے ہیں
وہ بھی خودکشی کے مترادف ہیں
کیونکہ ہمارا عہد
بارش کی طرح آئے گا
ہری، شاداب، قطعی سرحدوں
کے اعلان کے ساتھ!

انا ماریا پونسے

خود کلامی

میرے بچے اگر میں تمہیں نظر نہ آؤں
مجھے تم سے کہنا ہے کہ یاد رکھنا
میں نے تمہیں پیدا کیا تھا
اپنے پیٹ کے اندر
میں نے تمہیں زندگی کی بہترین سہولت دی
میرے خواب، میرے کلیجے سے لگے بچے
میں اور تم ایک رہے ہیں
تمہارے ہاتھ میرے ہاتھوں سے
اور تمہاری آنکھیں میری آنکھوں سے بنی ہیں
میں نے تمہارے وجود کو اپنی محبت سے
گوندھا تھا
میں نے تمہیں پیدا کیا

تمہارا باپ اور میں
تمہیں بازوؤں میں لیتے تھے
تم مستقبل کے بچے ہو
میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں
ہر چند تمہیں مجھ سے چھین لیا گیا
میں تم سے الگ نہیں ہوں
ہر رات خواب میں تمہیں تلاش کرتی ہوں
میں تمہاری مسکراہٹ، آنسو اور بغل گیر ہونے کی
مسرت کو یاد کرتی ہوں
وہ سارے بوسے جو تم مسکرا کر
اپنی نیلی ہری آنکھوں سے ارزاں کرتے تھے
اب تم میرے پاس ایک فوٹو کی شکل ہی ہو
رات پڑتے ہی تم سے ملاقات ہوتی ہے
مجھے لگتا ہے، میں دوبارہ زندہ ہوگئی ہوں
پھر صبح ہوتے ہی، فاصلہ قائم ہو جاتا ہے
خطرناک حد تک کی بے یقینی اور مسلسل اداسی
مجھے رُلا دیتی ہے، یہ مرحلہ بار بار آتا ہے
میرے ننھے! میں نے تمہیں اتنا پیار کیا ہے
کہ تم سے جدائی شاق گزر رہی ہے
تمہارے ننھے ننھے ہاتھ میرے کندھوں پر
پھر میں تمہارے ہونٹوں کو بوسہ دیتی تھی

تمہارے رخسار، میرے گالوں سے مل جاتے تھے
تمہاری ننھی آواز، ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں
مجھے پکارتی تھی
پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے
تم مجھے یاد نہیں کرتے ہو گے
اب وہ نہ چہرہ میرا رہا ہے
اور نہ ہاتھ
پتہ نہیں کتنی مدت کے بعد
ہم مل بھی سکیں گے
اگر نہیں تو تم مجھے دھندلی یادوں کے ساتھ
یاد رکھنا!

اوسولڈ وڈ ومینکو بابلی

ایک مقید شہر کے لیے

ہم وہی ہیں بیونس آئرس
اور بہت سے دوسروں کی طرح
یہاں آ کر، ہم لوگ
تمہارے بارے میں باتیں کرتے ہیں
تمہاری جیلوں، کلیساؤں اور
حکومتی عمارتوں کو سمجھنے کے لیے
جو کیڑوں سے بھری ہیں
اور ہم اُنہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں
ہم تمہارے اتواروں، سینماؤں
بسوں اور چمنیوں
تمہارے چوروں کے ٹھکانوں

تمہارے طوائف زدہ شہر کی
بیٹھی ہوئی گلیوں کو
دریافت کرنے کے لیے آئے ہیں

تمہاری روح تو نباتات کا باغ تھی
جہاں نیون سائن لگا دیے گئے تھے
اور وہاں پھول کھلنے سے پہلے ہی
مرجھا گئے تھے

اگر تم بغیر مسکراہٹ کے پیدا ہو
ٹوتھ پیسٹ بنانے والے
تمہارے لیے چمکتی ہوئی مسکراہٹ بنا دیں گے
اس کی نمائش مہمانوں کے سامنے کریں گے
اگر تمہارے اندر خون نہیں ہوگا
تو وہ تمہاری پیاس کو لامشروب سے
بجھائیں گے
وہ تمہاری راتوں، درختوں اور ہر جگہ
حتیٰ کہ ہوا کا وہ حصہ جو تمہاری طرف
آتا ہے
آسمان کا وہ ٹکڑا جو تمہیں عزیز ہے
اس کو چھیننے کی کوشش کریں گے

مگر میں خود کو اپنے عہد کی
سب سے بڑی شاعرہ نہیں کہہ سکتی ہوں
میں اپنا کتبہ موت سے پہلے
اس لئے لکھنا چاہتی ہوں
کہ دوسرے ملکوں میں مصروف
میرے بیٹوں کو
شاید فرصت ہی نہ ملے
یا پھر دھیان ہی نہ آئے
مجھے اپنے آپ کو دائم کرنے کا خیال
کیوں آ رہا ہے!
کیا کتبہ دائمیت کی نشانی ہوتا ہے
لندن میں مارکس کا کتبہ دیکھ کر
اس کے کارناموں اور خود اُسے
فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے
کچھ لوگ عظیم شاعر تھے
مگر ان کو کتبہ بھی میسر نہیں آیا
ظہور نظر ___ ایک بڑا شاعر
جیسا اکیلا تھا ویسا ہی پڑا ہے
خوشونت سنگھ نے اپنی راکھ
پاکستان کے دریا میں ڈالنے کی
وصیت کی تھی

مگر وہ تمہارے گرم سرخ دل کی گرمائش
کو چھین نہیں سکیں گے
یہی تو مستقبل کا شہرِ مسرت ہے
یہی عظیم بندرگاہ ہے
ہمارے کسانوں، مزدوروں کے
جمہوری ملک کے لیے۔

ایڈرن رچ[1]

مشکل لفظوں کی اٹلس سے

مجھے اندازہ ہے
تم نے اسی نظم کو بہت دیر سے پڑھنا شروع کیا
دفتر سے روانہ ہونے سے پہلے
اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی عمارت کی
مٹیالی سی کھڑکی کے نیچے
گہرے زرد لیمپ پوسٹ کے پاس
جب کہ چھٹی کا وقت
خاموشی میں تبدیل ہو چکا تھا

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
اس کتابوں کی دوکان میں
جو سمندر سے بہت دور

[1] امریکی شاعرہ جس کا انتقال 2015ء میں ہوا

بہار کے اولین موسم کے ملگجے سے دن
ہوا مہین ذروں کو تمہارے اردگرد
وسیع میدان میں اڑائے پھر رہی ہے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
جہاں تمہاری برداشت سے زیادہ
بہت کچھ ہو چکا ہے
جہاں بستر کی چادریں
گٹھڑی کی شکلوں میں پڑی ہیں
ایک کھلا ہوا بغیچہ تمہیں یاد کر رہا ہوگا
کہ تمہیں روانہ ہونا ہے
مگر تم ابھی نہیں جا سکو گے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
جیسے گراؤنڈ ٹرین کی تیز رفتاری
مندمل ہوتی ہے
اور سیڑھیوں کی جانب بھاگتے ہوئے
اک نئے طرز کے عشق کی جانب
جس کی تمہاری زندگی نے کبھی اجازت نہیں دی ہے

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم
ٹیلی وژن کی اسکرین کی روشنی میں پڑھ رہے ہو

جہاں بے آواز شکلیں آ جا رہی ہیں
اور تم انتظار کر رہے ہو انقباضہ کی خبر کا
مجھے معلوم ہے تم یہ نظم
ایک انتظار گاہ میں بیٹھ کر پڑھ رہے ہو
جہاں اجنبیوں سے کہیں آنکھیں ملتی، کہیں گریزاں رہتی ہیں
مجھے معلوم ہے تم یہ نظم فلا ریسینٹ لائٹ میں پڑھ رہے ہو
کہ نوجوانوں کی بوریت اور تھکاوٹ کہ جو بہت ہی نوعمری میں
اپنے آپ کو شمار بھی کرتے ہیں اور نہیں بھی کرتے

مجھے معلوم ہے تم نظم پڑھ رہے ہو
کمزور نظر ہونے کے باعث
محدّب شیشوں کی مدد سے
پڑھ رہے ہو
ان لفظوں کو وسعت دے رہے ہو
ہر چند مطلب سمجھ میں نہ آئے
تم پڑھے جا رہے ہو
کہ حروف بھی قیمتی ہوتے ہیں

مجھے معلوم ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
اسٹوو پہ دودھ گرم کرتے ہوئے
ایک روتا بچہ تمہارے کندھے پر ہے
اور ایک کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے

کیونکہ زندگی مختصر ہے
اور تم بھی پیاسے ہو

مجھے پتا ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
کہ جو تمہاری زبان میں نہیں ہے
کچھ لفظوں کا اندازہ لگاتے ہوئے
باقی کو ایسے ہی پڑھ لیتے ہو
میں جاننا چاہتی ہوں
وہ کون سے لفظ ہیں

مجھے پتہ ہے تم یہ نظم پڑھ رہے ہو
ایسی چیز سننے کے لیے
جو امید اور تلخی کے درمیان الجھی ہوئی ہو
پھر اس کام کی جانب متوجہ ہوتے ہو
جس سے تم انکار نہیں کر سکتے ہو

مجھے پتا ہے تم یہ نظم اس لیے پڑھ رہے ہو
کہ تمہارے پاس پڑھنے کے لیے
کچھ اور نہیں ہے
جہاں کہ تم موجود ہو
ہنگامہ خیز! جیسا کہ تم ہو

غزل

تجھ سے وعدہ، عزیز تر رکھا
وحشتوں کو بھی اپنے گھر رکھا

اپنی بے چہرگی چھپانے کو
آئینے کو اِدھر اُدھر رکھا

اک ترا غم ہی اپنی دولت تھی
دل میں پوشیدہ بے خطر رکھا

آرزو نے کمال پہچانا
ہر تعلق کو طاق پر رکھا

اس قدر تھا اداس موسمِ گل
ہم نے آبِ رواں پہ سر رکھا

اپنی وارفتگی چھپانے کو
شوق نے ہم کو در بدر رکھا

کلمۂ شکر کہ محبت نے
ہم کو تمہیدِ خواب پر رکھا

اُن کو سمجھانے اپنا حرفِ سخن
آنسوؤں کو پیامبر رکھا

غزل

یاد رکھو گے کہ اس گھر کے مکیں ہم بھی تھے
جب زمیں پوچھے گی کہنا کہ یہیں ہم بھی تھے
ایک موہوم سا رشتہ ہے سو رکھنا اس کو
تم جہاں جاؤ، سمجھ لینا وہیں ہم بھی تھے
دفن کرنا کسی دیوار کے سائے میں دعا
یاد کر کے کہ مرادوں کے امیں ہم بھی تھے
نہ کوئی عرض گزاریں گے جو ہوں گے رخصت
کون سمجھے گا تہہِ خاک نشیں ہم بھی تھے

غزل

ہم نے غم کھینچا تھا، ایذا طلبی کم نہ ہوئی
دل میں طوفاں نہ رکا، دربدری کم نہ ہوئی
ہم نے رسوائی بھی پہنی، تجھے رسوا نہ کیا
اے مرے شہر تری بے خبری کم نہ ہوئی
دل کی دہلیز مٹی، در نہ رہا، گھر نہ رہا
فتنہ سامانوں کی پر فتنہ گری کم نہ ہوئی
قصہ خوانی کہیں کی اور کہیں ڈھونڈا اس کو
جل بجھے داغ، پہ آنکھوں میں نمی کم نہ ہوئی
ہم تو طوفان بہ دل رکتے رہے، چلتے رہے
پیاس بجھتی ہی رہی، تشنہ لبی کم نہ ہوئی
فاصلے کم نہ ہوئے، شوقِ سفر کم نہ ہوا
اس سے ملتے رہے، بیگانہ روی کم نہ ہوئی

غزل

التزاماً کوئی حواہش نہیں کی جا سکتی
خانقاہوں میں تو پرسش نہیں کی جا سکتی
اب اجازت ہی کہاں ہم کو سخن کرنے کی
بولنے کے لیے کوشش نہیں کی جا سکتی
تو نے دریاؤں کو صحراؤں میں بدلا ہے بہت
آسماں تجھ سے سفارش نہیں کی جا سکتی
یا خدا خواب بنا دے مجھے ہلکا کر دے
یہ نہ کہنا کہ یہ بندش نہیں کی جا سکتی
وہ جو شیطاں کی طرح زخم بناتے جائیں
ان خداؤں کی پرستش نہیں کی جا سکتی
مانگتا کیا ہے فلک، چشمِ فراموشی سے
زخم اتنے ہیں کہ جنبش نہیں کی جا سکتی
ڈھونڈتے کیا ہیں گلستاں میں رہا کچھ بھی نہیں
اس خرابے میں تو شورش نہیں کی جا سکتی

میرادل بھی راکھ ہونا چاہتا ہے
پر میرا مذہب اجازت نہیں دیتا ہے
یوں تو دفن ہونے کے بعد
وجود خاک ہی بن جاتا ہے
کتبہ آپ کو نہیں
آپ کے زمانے کو زندہ رکھتا ہے۔

غزل

اجلی شام میں لپٹا وعدۂ تازہ، میرے اندر تھا
باہر کیسے جاتی میں، دروازہ میرے اندر تھا

شام کو صبح میں، صبح کو شام میں، خود ہی میں نے بدلا تھا
ہر نخچیر کا گویا ہر خمیازہ میرے اندر تھا

حرف تراشے تھے میں نے اور تم نے خرید لیے تھے
صدیوں تک جیسے پھیلا شیرازہ میرے اندر تھا

قفلِ محبت مجھ سے کیا، وہ تم سے بھی تو کھلا نہیں
یوں تو شیشۂ جاں کا ہر اندازہ میرے اندر تھا

آنکھیں دشت کی صورت ہوئی ہیں، جب سے رستے جدا ہوئے
ویسے گنبدِ شوق کا ہر آوازہ میرے اندر تھا

بھول نہیں سکتی وہ ساعت، وہ منظر کسی عالم میں
شامِ شفق تھی اور بکھرتا غازہ میرے اندر تھا

ساری بستی سوگوار تھی، جب لفظوں کی موت ہوئی
گور پڑا تھا کوئی اور، جنازہ میرے اندر تھا

غزل

میں سرکشیدہ رہی، عمر بھر سجھاتے رہے
وہ لوگ جو مرے رستے میں آتے جاتے رہے
میں آبجو تھی، سمندر نہ بن سکی اور لوگ
قیاس کرتے رہے، داستاں بناتے رہے
کوئی نہ تھا مرا خورشید جو بجھا سکتا
مرے قریب جو آئے جھلس کے جاتے رہے
مصاحبت تھی، رفاقت تھی، سب ہیولے تھے
یہ سانحے مری دہلیز کو سجاتے رہے
ہوا نے کاٹ دی تحریر میرے اشکوں کی
یہ داغ دل میں نیا آشیاں بناتے رہے
ہجومِ دل زدگاں میرے ساتھ چلتا رہا
ہوا کے ہاتھ ہی تصویرِ جاں بناتے رہے

غزل

وہ عجب عہدِ وفا تھا کہ جدا تھے ہم لوگ
زندگی تیرے تماشے سے سوا تھے ہم لوگ

کون طوفان بدن آن کے ٹھہرا دل میں
رقصِ شعلہ تھے، کہیں موج نما تھے ہم لوگ

اب ہیں دہلیز پہ ٹھہرے ہوئے زخموں کے نشاں
ورنہ تو خواب زمانوں کے خدا تھے ہم لوگ

کبھی امید حوالہ تھی کبھی پیاس حشم
دامنِ خواب کہ صحرا کی ردا تھے ہم لوگ

وہ ٹھہرتا بھی کہاں اور کسے اپنا کہتا
آتی جاتی ہوئی لہروں کی صدا تھے ہم لوگ

رنج کو ضد تھی کہ ہمزاد ہی بن کر جینا
اس لئے گلشنِ جاں، آبلہ پا تھے ہم لوگ۔
ہم سے رشتوں کی تمازت نہیں جھیلی جاتی
ہم سے بیگانہ ہی رہیو کہ ہوا تھے ہم لوگ
منزلیں راستہ پوچھیں، وہ مسافر ہم تھے
آسماں ڈھونڈنے نکلے، وہ دعا تھے ہم لوگ

غزل

جذب کر لیتے ہیں ہر دکھ کو سمندر کی طرح
اے مرے خواب ٹھہر جا کسی گوہر کی طرح

اپنی دیوانگی سونپی نہیں دیواروں کو
خلوتِ جاں میں رہے شہرِ معطر کی طرح

گردشیں اپنا مقدر تھیں تو ملتیں کس کو
زندگی تجھ کو گزارا بھی ہے پتھر کی طرح

آئینہ ہے کہ جو باور نہیں کرنے دیتا
اس کی قربت کو کسی گل کسی عنبر کی طرح

اک دیا ہاتھ میں ٹھہرا رہا، جلتا بھی رہا
ہم نے اپنایا ترا زخم صنوبر کی طرح

ہم نے مایوسیاں پہنی نہیں پھر بھی دل میں
وہ ٹھہرتا ہی نہیں آ کے مسافر کی طرح
موج کی طرح کبھی مجھ سے لپٹ جاتا ہے
اور گریزاں ہے کبھی قطرۂ محشر کی طرح
مجھ کو اندازہ نہ تھا تیری طلب کا ورنہ
میں اتر جاتی ترے دل میں سمندر کی طرح

غزل

وہ اگر آئے تو پھر دل میں تماشا ہو گا
بات کرنے کے لیے کوئی فسانا ہو گا
شام ہو گی تو پکارے گی مجھے آنکھوں میں
کہکشاں ہاتھ میں ٹھہرا ہوا رستا ہو گا
زخم آنکھوں کی کہانی نہیں کہنے دیتے
پھر مرا عہدِ تمنا یونہی رسوا ہو گا
اے مری گمرہی، تو گود اداسی کو نہ لے
ورنہ تجھ سے بھی کہاں کوئی مداوا ہو گا
وہ تو آئے گا دبے پاؤں گزر جائے گا
جانکنی ٹھہر کہیں تو کوئی رستہ ہو گا
اس کی خوشبو ہی مجھے دشت میں بہلائے پھری
جس کے سائے کو میں سمجھی تھی سراپا ہو گا

غزل

دل نے چاہا تھا کہ ہو آبلہ پائی رخصت
زندگی دیکے ہوئی شعلہ فشانی رخصت
تم نے جب شمع بجھائی تو سمجھ میں آیا
ایک موہوم سا رشتہ تھا، سو وہ بھی رخصت
میں اداسی سرِ بازار بھی لاؤں ایسے
جیسے پانی کی تمنا میں ہو کشتی رخصت
میرے اصرار پہ موجود تھا گھر پہ لیکن
اس نے خاموش لباسی میں لکھی تھی رخصت
تیری تائید کی تصویر سے جی اٹھے تھے
نہیں معلوم تھا، یہ ریت ہے، پانی رخصت
میں حوالہ تری تحریر کا کس نام سے دوں
مجھ سے تو مانگ چکا حرفِ تعلّی رخصت

غزل

خوش بیاباں میں مگر شہر میں ڈرنا اس کا
کاسہ ہاتھوں میں لیے گھر میں بھی پھرنا اس کا
دل دُکھا کے کبھی ہنسنا، کبھی رونا اس کا
میرے آنگن میں لکھا تھا نہیں بسنا اس کا
اس نے تنہائی میں بھی انجمن آرائی کی
چاند نے دیکھ لیا آنکھوں کو بھرنا اس کا
میں نے دیکھا ہے سرِ شام اُداسی کا خرام
پاؤں میں چھالے پہن کے نہ ٹھہرنا اس کا
آئینہ دیکھنا منظور نہیں تھا اس کو
لطف دیتا تھا ہوا بن کے گزرنا اس کا
ہر خلش آن کے رکتی تھی مری بانہوں میں
زندگی دیکھتی رہتی تھی تڑپنا اس کا
ہے عجب طرزِ ملاقات، عجب طرزِ سفر
پاس آ کے نہ ٹھہرنا نہ گزرنا اس کا

غزل

ہم نے کہنے کو تمہیں دل سے بھلایا ہوا ہے
بس یہی داغ ہے، سینے میں چھپایا ہوا ہے
اب گرے گی بھی تو کیسے کہ بہت صبر کے ساتھ
ہم نے دیوار کو ہاتھوں سے بنایا ہوا ہے
بات کرنے کو بہت دیر سے سوچا، اس سے
جس کی تحریر کو آنکھوں میں بسایا ہوا ہے
چشمِ بے عیب میں اس کا ہی سراپا کیوں تھا
جس کا غم، حدِ تمنا میں سمایا ہوا ہے
خواہشِ قرب کے پیوند ہیں ہاتھوں میں مرے
اے جنوں زاد مجھے کتنا ستایا ہوا ہے
کوئی کہتا ہے رفاقت نہیں ملنے والی
کوئی کہتا ہے وہ دہلیز پہ آیا ہوا ہے
وصل کی شام کا اندازہ بہت مشکل تھا
ہم نے پوچھا تھا مگر اس نے چھپایا ہوا ہے